© rasailojaraid.com

اقبال کا نظریۂ خودی اور بیخودی

(فہمیدہ کبیر صاحبہ ایم۔ اے۔ (علیگ)

اقبال کو فلسفی شاعر کہا جاتا ہے کیونکہ انھوں نے اُردو شاعری کو ایک فلسفیانہ فکر عطا کی۔ فلسفیانہ شاعری سے مراد یہ ہے کہ زندگی کے متعلق ان کا ایک خاص نظریہ اور ایک منظم و مربوط طرزِ فکر ہے جسے شاعری کا آب و رنگ دے کر انھوں نے ہمارے سامنے پیش کیا۔ ان سے پہلے یہ اندازِ فکر اُردو شاعری میں نظر نہیں آتا۔

زندگی کے متعلق حکمائے سلف نے مختلف نظریات پیش کئے ہیں۔ مثلاً افلاطون اور ارسطو دونوں کے نزدیک زندگی کی بنیادی حقیقت عقل ہے۔ عمل کو وہ ثانوی درجہ دیتے ہیں۔ اقبال کے نظامِ فکر میں عمل کو فوقیت حاصل ہے۔ تسخیر و تخلیق کو وہ اصل مقصدِ حیات بتاتے ہیں، ان کے خیال کے مطابق سکون سے زندگی کا تماشا کرنے سے زندگی کی ماہیت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ تسخیر و تخلیق کا عمل بغیر جذبۂ خودی کے تکمیل پذیر نہیں ہوتا۔ اس لیے خودی کا فلسفہ ان کے نظریۂ حیات کا محور ہے۔ اس کی تفصیل میں جانے سے پہلے یہ جان لینا مناسب ہے کہ اس تصور تک ان کی رسائی کن راہوں سے ہوئی۔

اقبال کے یہاں شروع ہی سے تلاش و جستجو کا ایک جذبہ ملتا ہے۔ انھوں نے جب آنکھ کھولی تو اپنے گرد ایک زوال پذیر ماحول پایا۔ اس کے اسباب کا پتہ لگانے کے سلسلے میں عام طور پر قوموں کے عروج و زوال کا تنقیدی جائزہ لیا۔ بالآخر اس نتیجے پر پہونچے کہ قوموں کا زوال حکومت کے جانے سے نہیں ہوتا بلکہ تعیش اور کاہلی، مذہب و اخلاق کی بنیادی اقدار کو صدمہ پہونچاتی ہے اور اسی سے ذوقِ سعی و عمل میں تباہ کن اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حکومتوں کے زوال کی بنیادی وجہ ہے۔ اقبالؔ کا عہد بھی اسی جمود کا شکار تھا۔

یہ روحانی تعیش اور بے عملی دراصل وحدت الوجود کے عقیدے سے ظہور میں آئی جو اقبالؔ کے نزدیک غیر اسلامی اثرات کا نتیجہ تھا مسلمانوں میں سب سے پہلے یہ نظریہ شیخ محی الدین ابن عربی نے تفصیل کے ساتھ پیش کیا۔ یہ عقیدہ چونکہ نفیٔ ذات پر زور دیتا ہے اس لیے مسلمان رفتہ رفتہ ذوقِ عمل سے محروم ہو کر جمود کی اس منزل تک پہنچ گئے جہاں سعیٔ و عمل کی قوتیں شل ہو جاتی ہیں۔ اقبالؔ نے اس جمود کے خلاف آواز بلند کی اور قوم کو عمل کا پیغام دیا۔ پیامِ مشرق کے دیباچے میں کہتے ہیں:" زندگی اپنے گرد وپیش کوئی انقلاب نہیں پیدا کر سکتی جب تک کہ اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا کوئی خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک اس کا وجود انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو" اس ذہنی انقلاب کو وجود میں لانے کے لیے ضرورت تھی مسلسل جدّ و جہد اور عمل و پیکار کی جس کی تکمیل جذبۂ خودی کے بغیر ممکن نہیں۔ چنانچہ انھوں نے خودی کا فلسفہ پیش کیا جو نظریۂ وحدت الوجود کا ردِّ عمل ہے۔

اس فلسفے کے متعلق اسرارِ خودی کے دیباچے میں کہتے ہیں:" خودی کا سرگرم کائنات ہستی کے ہر ذرّے میں نمایاں ہے۔ لیکن اس کا انتہائی کمال انسان کی ذات میں ظاہر ہوتا ہے" تصوف کے اثر سے خودی کا لفظ غرور و تکبر کے ہم معنی خیال کیا جانے لگا تھا۔ اقبالؔ نے اس کو ایک وقار بخشا اور پہلے پہل تعین ذات اور عرفانِ نفس کا مفہوم اس سے وابستہ کیا۔

اقبالؔ کے یہاں خودی کا تصور حقیقت میں قرآنِ کریم کے نیابتِ الٰہی کے تصور سے مختلف نہیں۔ انھیں نفسِ انسانی میں ایک زوالِ ناآشنا اور ارتقا کوش حقیقت کا احساس ہوتا ہے اسی کو وہ خودی سے تعبیر کرتے ہیں ؎

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات

خودی کو اپنے استحکام و بقا کے لیے عشق کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یہاں یہ واضح کر دینا مناسب ہے کہ اقبالؔ نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اُردو شاعری کی قدیم اصطلاحات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہی استعمال کی ہیں۔ لیکن ان کے یہاں انھوں نے نیا رنگ اختیار کرلیا ہے۔ چنانچہ لفظِ عشق بھی ان کے یہاں جذبۂ تخلیق وارتقاسے عبارت ہے۔ اقبالؔ کے خیال کے مطابق عشق کو خودی سے اور خودی کو عشق سے استحکام حاصل ہوتا ہے۔ عشق ہی سے انسان کے دل میں آرزو اور جذبۂ جہد کی لگن پیدا ہوتی ہے جو خودی کے بقا کی ضامن ہے۔ ان کے نزدیک بقا اور ارتقا کے اس میلان کا نام عشق ہے۔ جو ہر قدم پر ایک نئے مرحلے سے دوچار ہونا چاہتا ہے ؎

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

ان کے نظامِ فکر میں عشق وخودی دو مترادف الفاظ بن گئے ہیں۔ عشق کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ انسان پر اس کی خودی کو آشکار کرکے اسے اپنے وجود کی تخریبی قوتوں پر فتح پانے کے قابل بناتا ہے۔ نظریۂ خودی کے تحت انسان بھی خالق ہے۔ آرزو اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا دیتی ہے اور عشق اس آرزو کو زندہ اور بیدار رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں اقبالؔ رومیؔ کے ہمخیال ہیں جن کے نزدیک تمام کائنات ایک ضرورت کے تحت وجود میں آئی۔ اگر انسان آرزو کو فنا کردے تو ارتقا اور تکمیلِ حیات کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ آرزو کو اپنی تکمیل کے لیے جس مسلسل حرکت اور عملِ پیہم کی ضرورت ہے وہ عشق کے سبب سے ظہور میں آتا ہے۔ یہی عشق جو دراصل عشقِ الٰہی ہے نظریۂ خودی کا مرکز ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وحدت الوجود کے فلسفے کی بنیاد بھی تو عشقِ الٰہی ہے۔ پھر اس فلسفے سے اقبالؔ کا اختلاف کن بنیادوں پر ہے۔ اس کو اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ عشق اگر وصال کی منزل تک پہونچ جائے تو آرزو کا خاتمہ ہوجاتا ہے جس کا وجود جذبۂ عمل کو بیدار و برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے، خدا نے اس کائنات کی تخلیق ایک خاص مقصد کے تحت کی ہے۔ انسان کی ہستی کائنات میں ایک اعلیٰ مرتبہ رکھتی ہے اسی مناسبت سے اس کا مقصدِ حیات بھی ارفع واعلیٰ ہے۔ اگر زندگی کا یہی مقصد ہو تاکہ وہ دنیا میں آکر اپنی ہستی کو پھر اپنے خالق کی ہستی میں ضم کردے تو پھر کائنات کی تخلیق بے معنی ہوجاتی ہے۔ اور یہ کسی طرح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی نہیں کہا جا سکتا کہ خدا کا کوئی فعل خالی از مصلحت ہے۔ اس لیے اقبال کے نزدیک حیاتِ انسانی کا مقصد آرزوئے وصال ہے وصال نہیں۔ یہ آرزو انسان کو تسخیرِ کائنات پر مجبور کرتی ہے جس کے لیے ہمہ وقت سرگرمِ عمل رہنا ضروری ہے۔ اقبال عشق میں وصال پر فراق کو ترجیح دیتے ہیں ؎

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

فلسفۂ وحدت الوجود وصالِ محبوب پر زور دیتا ہے۔ یہی بنیادی وجہ ان کے اختلاف کی ہے۔

جدوجہد کا مقصد غیرِ خودی کی تسخیر کرنا ہے جو انسان اور اس کے خالق کے درمیان ایک وسیع خلیج کی صورت میں حائل ہے۔ اقبال ان تمام قوتوں کو جو تکمیلِ خودی کی راہ میں حارج ہوں غیرِ خود سے تعبیر کرتے ہیں۔ خودی کا ارتقا غیرِ خود کے مسلسل تصادم و پیکار سے عمل میں آتا ہے۔ اس تصادم کی دو صورتیں ہیں داخلی اور خارجی۔ داخلی تصادم وہ ہے جس میں انسان اپنے نفس کی تخریبی قوتوں کو زیر کرنے کے لیے ان سے نبرد آزما رہتا ہے۔ خارجی تصادم مراحلِ کائنات کی تسخیر کا نام ہے۔ عشق ان خلیجوں کو عبور کرنے میں مدد دیتا ہے۔ جس نسبت سے انسان غیرِ خود پر فتح پا کر اپنی خودی کی تکمیل کرے گا اسی مناسبت سے اس کا درجہ مدارجِ حیات میں بلند ہوگا۔ اقبال خودی کی ماہیت پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں ؎

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات — خودی کیا ہے بیداریِ کائنات
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے — نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
زمانے کے دھارے میں بہتی ہوئی — ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر — ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

نئے نئے مقاصد کی تکمیل اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں غیرِ خودی کی تسخیر کا راز پنہاں ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ یہ کائنات خودی کا مظہر ہے۔ انسان کو اس بیج

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خدا نے اشرف المخلوقات بنایا ہے کہ وہ اپنے خالق کی خودی کو تسلیم کرتے ہوئے اس تک پہو
کی کوشش کرے۔ اس کوشش کا انحصار احکام ایزدی کی تعمیل اور اپنے مقصدِ حیات کی تکمیہ
پر ہے۔ ان کے یہاں انسان کی خودی کی آخری منزل فنا فی اللہ ہونا نہیں "یزداں گیری"

اقبال نے خودی کے تین مدارج قرار دئے ہیں۔ اطاعتِ الٰہی، ضبطِ نفس اور نیابر
الٰہی۔ خودی میں تعمیری اور تخریبی دونوں قوتیں ہیں۔ وہ اطاعتِ الٰہی اور ضبطِ نفس کے مدار
کو خودی کے ارتقا میں ضروری خیال کرتے ہیں۔ ان سے گزر کر انسان اپنے نفس کی تخریبی قوتو
پر فتح حاصل کرتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اقبال خودی کی سرکشی کے قائل نہیں
انھیں مدارج سے گزر کر انسان نیابتِ الٰہی کے درجے تک پہونچتا ہے جو خودی کی معراج ہے
اقبال کے مردِ مومن کا نصب العین اسی منزل تک پہونچنا ہے۔

ابتدائی دونوں مراحل سے گزرے بغیر خودی کی تعمیری قوتیں نہیں ابھر سکتیں۔ اقبال
شیطان کو بدی کی طاقت نہیں مانتے۔ ان کے خیال کے مطابق وہ خودی اور تخلیق کی وہ
عظیم الشان طاقت ہے جو اطاعت کے راستے سے بھٹک کر تخریب کے راستے پر گامزن ہو گئی
ہے۔ ان کے نزدیک ہٹلر کی خودی بھی ایسی خودی تھی جو اطاعت اور ضبطِ نفس کے مدارج سے
نہ گزرنے کے باعث اپنی تخریبی قوت کا شکار ہو گئی۔

نیابتِ الٰہی کے تصور ہی سے اقبال مردِ کامل کے تصور تک پہونچتے ہیں۔ جو کامل خودی
کا مظہر ہے۔ جہاں تک مردِ کامل کا تعلق ہے اس سلسلے میں اقبال کو نطشے سے بہت مدد
ملی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ نطشے کا "فوق البشر" اقبال کے یہاں "خیر البشر" کی شکل
میں ملتا ہے۔ اقبال کے مردِ مومن کی تشکیل میں جلال کے ساتھ ساتھ جمال کی بھی کارفرمائی
ہے۔ کیونکہ وہ قرآن کا نصب العینی آدم ہے۔ اس کے برخلاف نطشے کا Superman
قوت و جلال و جبروت کا مجسمہ ہے۔ وہ خودی کی تکمیل میں اطاعت اور ضبطِ نفس کے مدارج
سے نہیں گزرتا۔ اقبال کا مردِ مومن خدا کی مرضی کا تابع ہے اس لیے اس میں "قاہری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یا دلبری اور دلبری با قاہری، کی شان نظر آتی ہے۔

اقبال نے سب سے پہلے خودی کے مضمون کو اسرارِ خودی میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بانگِ درا میں "شمع و شاعر" کے بعد اس طرف اشارے ملتے ہیں۔ پیامِ مشرق، زبورِ عجم، جاوید نامہ وغیرہ میں خودی کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ بالِ جبریل میں خودی کا تصور انھیں اس قدر عزیز ہے کہ اس کا دامن نہیں چھوڑ سکتے۔ اس سلسلے میں "ساقی نامہ" بہت اہم ہے جس میں خودی کی ابتدا، ارتقا اور انتہا کے متعلق بڑے دل نشین انداز میں خیالات یکجا کئے ہیں۔

خودی کے فلسفے کو اقبال کی شاعری کے تہذیبی اور تمدنی پس منظر میں دیکھا جائے تو اس کی اہمیت اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ یہ وہ دور تھا جب فرد کی اہمیت کا احساس پیدا ہو گیا تھا اور مختلف صورتوں میں ظاہر ہو رہا تھا یہی احساس اقبال کے یہاں فلسفۂ خودی کی صورت میں سامنے آیا۔

خودی کے ساتھ ہی اقبال کے یہاں بے خودی کا تصور بھی ملتا ہے۔ خودی کا ایک پہلو انفرادی ہے دوسرا اجتماعی۔ انفرادی خودی جماعت کی خودی میں مل کر ایک بڑی خودی کی تخلیق کرتی ہے۔ اسی کو اقبال بے خودی کا نام دیتے ہیں۔ خودی کے انفرادی پہلو کی تکمیل اسی وقت ہوتی ہے جب افراد اپنے آپ کو ایک لڑی میں پرو دلیں۔ اس طرح انفرادی خودی کی تکمیل سے اجتماعی خودی کی تشکیل ہوتی ہے۔ اقبال کے نزدیک صرف فرد ہی کی خودی مقصود بالذات نہیں کیونکہ ؎

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

"رموزِ بیخودی" میں فرد اور جماعت کے اسی فرق اور باہمی رشتے کو واضح کیا ہے۔

جماعت کا تصور اقبال کے یہاں بہت وسیع ہے۔ وہ ہر اس نظریے کی مخالفت کرتے ہیں جو انسانیت کے آفاقی تصور میں خارج ہو۔ بیخودی کا تصور جس میں رنگ و نسل اور وطن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا احساس مٹ جاتا ہے بڑی حد تک اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی بڑھتی ہوئی قومیت تحریکوں کا ردِ عمل ہے۔ ملت کی تعریف ان کے یہاں یہ ہے ؎

با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ۔

خیال کی وحدت ملت کی سب سے بڑی پہچان ہے اور یہ خیال توحید کا عقیدہ ہے جس کے دائرے میں آکر مفلس و تونگر میں تفریق باقی نہیں رہتی۔ اسی لیے اقبال جمہوریت کے تصور کے بھی خلاف ہیں جس کے پردے میں ایک مخصوص طبقہ اپنے مفاد کے لیے ہزاروں افراد کا خون بہاتا ہے۔ ان کے یہاں جمہوریت کا تصور قرآنی تصور ہے ؎

پیش قرآن بندہ و آقا یکے ست
بوریا و مسند و دیبا یکے ست

یہ ہے اقبال کے فلسفۂ خودی و بیخودی کا خلاصہ۔

دارالعلوم دیوبند کا علمی، دینی ترجمان

ماہنامہ **دارالعلوم** دیوبند

گزشتہ ۲۰ سال سے پابندیٔ وقت کے ساتھ جاری ہے، کتاب و سنت کا بہترین شارح، تعلیماتِ اسلامیہ کا ترجمان، مسائلِ عصریہ اور افکارِ جدیدہ کے متعلق اس کے محققانہ مضامین سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دارالعلوم کے دارالافتاء کے تازہ فتاویٰ، اور بزرگانِ دیوبند کے قیمتی مقالات رسالہ دارالعلوم میں ملاحظہ فرمائیے۔ سالانہ چندہ ساتھ روپے، منی آرڈر سے روانہ فرمائیے، وی، پی کی فرمائش نہ کیجئے۔ نمونہ کے پرچہ کے لیے ۶۵ پیسے کے ٹکٹ آنے چاہئیں۔

خط و کتابت کا پتہ: سید محمد ازہر شاہ قیصر، ایڈیٹر رسالہ دارالعلوم دیوبند (یوپی)

© rasailojaraid.com